قِتال میں اِثُخان کا مرادی معنیٰ اور اِسلامی قِتال کے حقیقی نقوش

THE MEANING OF ITIKHAN IN QITAL AND THE ORIGINAL CONCEPT OF ISLAMIC QITAL

DR ARIF KHAN SAQI

Associate Professor, Chairman Department of Islamic Learning, University of Karachi.

Email: maksaqi@.edu.pk

Saqi,Arif Khan "**The meaning of Itikhan in Qital and the Original Concep of Islamic Qital**" Al-Raheeq International research Journal Vol 2, Issue. 1 (January 29, 2023). Pg no: 1-24

Journal	Al-Raheeq International research Journal
Journal homepage	https://alraheeqirj.com
Publisher	Al Madni Research Journal
License:	Copyright c 2023 NC-SA 4.0 www.alraheeqirj.com
Published online:	2023-01-29
ISSN No:	
Print version	2559-7005
Online version	2959-7013

AL-RAHEEQ International Research Journal
Vol. 2, Issue. 1 || January-June 2023 || P. 1-24

قِتال میں اِثْخَان کا مرادی معنٰی اور اِسلامی قِتال کے حقیقی نقوش

THE MEANING OF ITHIKHAN IN QITAL AND THE ORIGINAL CONCEPT OF ISLAMIC QITAL

ABSTRACT:

The word اَلْاِثْخَان has been usen in two places in Quran Kareem, Surah Anfal:67 and Surah Muhammad :4. This word is used in the words of Arabic literature which are rarely used or to be used in very rare situation.

Determining the meaning of the Quranic term of this type requires careful observation, as from Prophethood to post Prophecy, the language and interpretations of many Arabic text has been changed and specified with the passage of time era.

It is worth noting that in both places this word clarifies the circumstances of battles fought by Holy Prophet PBUH. And the delicacy of situation is such that possibility of having a profound effect on the entire system of thoughts and actions as a result of slight decrease and increase in meaning is very clear. There is a strong possibility that the Islamic point of view about war and other aspects of war will be affected by its

misinterpretations. The contemporary situation of abundance in killing and bloodshed in wars, which is against Islamic perspective and ideology, this Article describes the clear meaning of this word with the linguistic characteristic of this era, as well as the historical background of these verses, also discuss the interpretations of renown Islamic Scholars of different eras.

KEYWORDS: War, Bloodshed, Prophethood, Post- Prophecy, Arabic Literature, Islamic ideology

قرآن حکیم میں دو مقامات پر لفظِ " اَلْاِثْخَان "استعمال ہوا ہے۔ یہ کلمہ عربی ادب کے اُن کلمات میں شامل ہے جو بہت ہی قلیل الاستعمال ہیں۔ یا روزمرہ بول چال میں جس کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی ہے۔ بہت ہی کم یا بہت ہی خاص حالات میں یہ کلمہ استعمال ہوا کرتا تھا۔ اِس نوع کے قرآنی مفردات کے معنی مرادی کا تعین دقتِ نظری کا متقاضی ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں دو مقامات سورۂ انفال: 67 اور سورۂ محمد: 4 میں یہ کلمہ استعمال ہوا ہے۔ اِن مقامات سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ دونوں مقامات پر یہ کلمہ اثنائے قتال کی کیفیات واحوال کو واضح کرتا ہے۔ اور صورتحال کی نزاکت ایسی ہے کہ معنی مرادی میں کسی معمولی کمی بیشی کے نتیجے میں پورے نظامِ فکر و عمل پر گہرے اثرات مرتب ہونے کے امکانات بہت واضح ہیں۔ اور رائج الوقت تراجم قرآنیہ میں کچھ ایسی ہی صورتحال نظر بھی آتی ہے۔ لامحالہ جنگ کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر اور جنگ کے دیگر متعلقات کے متاثر ہونے کا امکان بھی قوی ہے۔

بلا شبہ اسلام امن و سلامتی ہی کا داعی ہے۔ جنگ و جدال اور قتل و خونریزی سے بچتا ہے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب بھی ہر گز نہیں ہو سکتا کہ اپنے مخالفین اور دشمنوں کو ایسی کھلی چھوٹ دے دے کہ وہ سب کچھ تباہ و برباد اور نیست و نابود کر کے ہی رکھ دیں۔ اِس لیے کہا جا سکتا ہے کہ جیو اور جینے دو کی حکمتِ عملی ہی بہتر ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ حالتِ امن میں اسلام کو زیادہ فروغ ملتا ہے اور اس کے مخالفین کو یہ چیز کسی طور گوارا نہیں ہے۔ لٰہذا جبر و تشدد کے ذرائع استعمال کرتے اور دوسروں کو بھی مجبور کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جنگ مسلمانوں کی مجبوری تو ہو سکتی ہے۔ مگر خواہش کبھی نہیں ہو سکتی۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ نے آپ ﷺ کا ایک خطبہ روایت کیا ہے جو جنگ کے آغاز سے پہلے رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا۔ اُس خطبہ میں اہل ایمان کو کیا تاکید و تلقین فرمائی گئی ہے؟ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ روایت کے کلمات حسبِ ذیل ہیں:

"يَاَيُّهَا النَّاسُ !لَا تَمَنَّوْا لِقَآءَ الْعَدُوِّ وَ سَلُوا اللهَ الْعَافِيَةَ ۔ فَاِذَا لَقِيْتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ"[1]

ترجمہ: اے لوگو! دشمن کے ساتھ جنگ کی تمنا مت کرو، اور اللہ سے عافیت ہی طلب کرتے رہو، پھر جب دشمنوں کے ساتھ جنگ ہو ہی جائے تو پھر ثابت قدمی دکھایا کرو۔ اور تمہیں یہ معلوم رہنا چاہیے کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔

اِسلام لوگوں کو دشمن بنانے اور اُن کو اپنے پیچھے لگا کر امن واَمان کی فضاء کو خراب کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ لٰہذا بے خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ سراسر امن اور سلامتی کا دین ہے۔ قتل و غارتگری اور خوں ریزی اِس کی سرشت میں ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں یہ فرق سمجھنے کی بھی ضرورت ہے کہ جہاد کا آغاز تو اُسی وقت ہو گیا تھا جب پہلی وحی نازل ہوئی تھی اور اس کا پہلا ہی کلمہ آپ ﷺ کے ساعت نواز ہوا تھا:

---

[1] ۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کراچی، قدیمی کتب خانہ، 1961ء، ص:25-224، ج:1

"اِقْرَاْ بِسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ"[2]

ترجمہ: پڑھ لیجیے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے۔

چنانچہ بارگاہ حق سے پڑھنے کا جو حکم صادر ہوا ہے اِس نے جہاد کو فرض کر دیا تھا اور جہاد یہیں سے شروع بھی ہو گیا تھا۔ اِس کا مطلب تھا راہِ حق میں پُر اَمن رہتے ہوئے جد وجہد جاری و ساری رکھنا۔ اور اِس جد وجہد کے لیے علم کا حصول اور اِس کا فروغ نا گزیر تھا۔ چنانچہ پہلا خطاب ہی یہی ہوا ہے۔ مگر قتال کی پورے مکی عہد کے دوران اجازت موقوف ہی رہی ہے۔ اَب آپ خود غور فرما لیجیے کہ قریش مکہ نے کیا کیا ستم نہیں ڈھائے تھے؟ مگر مسلمانوں پر مسلسل یہ پابندی عائد رہی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دے سکتے۔ اِس لحاظ سے پورے کا پورا مکی دور صرف صبر، تحمل اور قوت برداشت کا امتحان تھا۔ بالآخر سن 1 ہجری میں یہ پابندی ہٹا لی گئی تھی اور مسلمانوں کو بھی جنگ مسلط کرنے والوں کے ساتھ پوری قوت سے مقابلہ کرنے کا اِذن بارگاہِ حق سے مل گیا تھا۔ قتال کے تعلق سے اِس اجازت کو سورہ حج میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

"اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ۔ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ" [3]

ترجمہ: قتال کی اجازت دے دی گئی ہے اُن لوگوں کو جن پر جنگ مسلط کی جا رہی ہے اِس بنیاد پر کہ اُن کے اوپر واقعی ظلم ہوا ہے، اور یہ کہ اللہ اُن کی نصرت پر قادر ہے۔ وہی (مظلوم و پر امن) لوگ جنہیں اُن کے گھروں سے ناجائز طور پر بے دخل کر دیا گیا ہے، صرف اِتنی سی بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔

[2] (العلق:96، آیت:1)

[3] (الحج:22، آیت:39-40)

اِس آیہ کریمہ میں لفظ " أُذِنَ "یعنی: "اجازت دے دی گئی ہے"، اِس بات کی واضح نشاندہی کر رہا ہے کہ مسلمانوں کو قبل ازیں کسی بھی صورت میں تلوار اُٹھانے کی کوئی اجازت نہیں تھی۔ بعد ازیں اور ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں بھی ضرورت اور مجبوری کے تحت قتال کا حکم بھی دے دیا گیا تھا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

"اجازت ہماری تحقیق کے مطابق سن 1 ہجری میں نازل ہوئی اور حکم جنگِ بدر سے کچھ پہلے رجب یا شعبان سن 2 ہجری میں نازل ہوا"۔[4]

اگر کچھ مزید غور کیا جائے تو آیہ مبارکہ کے اپنے کلمات ہی یہ بات واضح کر دیتے ہیں کہ جن لوگوں سے جنگ کی جا رہی ہے انہیں جوابی طور پر جنگ کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ جنگ بدر سے پہلے ایسے کوئی جنگی حالات تو موجود ہی نہیں تھے۔ لہٰذا یہ اجازت رجب یا شعبان سن 2 ہجری کے آس پاس ہی معلوم ہوتی ہے۔ البتہ جنگ بدر کے موقع پر جب قریش مکہ کا جنگی جنون اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے ہی نابود کر دینے کے عزائم کھل کر سامنے آ چکے تھے تو مناسب تیاری کی ضرورت و اہمیت بھی اچھی طرح سے معلوم ہو گئی تھی۔ چنانچہ اِن حالات میں قتال کا حکم بھی ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا جنگ بدر کے بعد زخم خوردہ قریش مکہ کے اگلے عزائم کے پیش نظر اور اُحد سے پہلے ہی کسی موقع پر قتال کے لیے مناسب تیاری رکھنے کا باقاعدہ حکم بھی وارد ہوا ہے۔ اور حسبِ ضرورت ترغیب بھی دی گئی ہے۔ راہِ فرار اختیار کرنے والوں کے معاملے میں ترہیب کو بھی بروئے کار لایا گیا ہے۔

ویسے بھی قدیم عالمی دستور ہے کہ جب ایک فریق جنگ کا آغاز کرتا ہے تو اُس جنگ کا اختتام دوسرے فریق کی رضامندی پر ہی موقوف ہوتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تو یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ جنگ و جدال اسلامی خواہش نہیں ہو سکتی۔ اسلام کا پیغام ہی اتنا مؤثر اور طاقتور ہے کہ دلوں تک کو فتح کر کے اپنے بدترین دشمنوں کو بھی اپنا جانثار اور گرویدہ بنا لیتا ہے۔ کتنے ہی عظیم المرتبت صحابہ کرام ہیں جن کے حقیقی باپ اسلام دشمنی میں پیش پیش رہے۔ حتیٰ کہ

---

[4] مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، تفہیم القرآن، لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، جنوری: 2008ء، ص: 232، ج: 3

اِسی راہ میں مارے بھی گئے ہیں۔ مگر اُن کے فرزند اسلام کے حقیقی پاسدار اور جانثار بن کر سامنے آئے ہیں۔تاریخ میں ایسی اَن گنت مثالیں بکھری پڑی ہیں۔ یہ دین حیات بخشی کا ضامن بن کر آیا ہے۔ جبکہ جنگ کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں سے بھی سب واقف ہیں۔اِن دونوں کے درمیان کوئی جوڑ نہیں ہے۔ پھر اگر جنگ مسلط کر دی جاتی ہے، جیسا کہ ابھی اوپر بیان کی گئی،اذن کے کلمات سے بھی ظاہر ہے: **"اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا"**[5]یعنی: **"**اُن لوگوں کو بھی قتال کی اجازت دے دی گئی ہے جن پر جنگ مسلط کی جارہی ہے۔اِس بنیاد پر کہ اُن کے اوپر واقعی ظلم ہوا ہے**"**،تو اِن ظلم کا شکار بننے والوں کو جنگ وجدال کے اصل خواہشمندوں کے سامنے کھڑا کر کے اُن کا تر نوالہ بننے سے روکا گیا ہے۔اِس تناظر میں نہ تو جنگ اسلامی خواہش رہ جاتی ہے اور نہ ہی جنگی قیدی مسلمانوں کی طلب بنتے ہیں۔ بلکہ جنگ کے لازمی نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے جس کے ساتھ اِسلام اپنے خمیر کے مطابق معاملات کو آگے بڑھائے گا۔ چنانچہ مشرکین مکہ کے ساتھ میدانِ بدر میں لڑی جانے والی پہلی باقاعدہ جنگ سے ہاتھ آنے والے قیدیوں کے تعلق سے ارشادِ باری ہے:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَا اَخَذْتُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِيْ اَيْدِيْكُمْ مِنَ الْاَسْرٰى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِمَّا اُخِذَ مِنْكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ[6]"

[5] (الحج:22،آیت:39-40)،

[6] " (الانفال:8،آیات:67-70)

ترجمہ: کسی بھی نبی کے لیے یہ مناسب ہی نہیں ہوتا کہ جب تک وہ روئے زمین پر ایک مربوط بندوبست پر مبنی نظام قائم نہ کرلے، اُس کے پاس کچھ قیدی ہوا کریں، تم دنیاوی ساز وسامان کو دیکھتے ہو اور اللہ آخرت کا ارادہ رکھتا ہے، اور اللہ بہت ہیبت ودھاک رکھنے والا حکیم ہے۔ اور اگر اللہ کا پہلے سے لکھا موجود نہ ہوتا تو یقیناً تم لوگوں کو بھی بڑی سزا مل جاتی۔ تو اَب جو بھی حلال و پاکیزہ غنیمت تم لوگوں کے ہاتھ آئی ہے اُس میں سے کھاؤ، اور ڈرتے رہو اللہ سے یقیناً اللہ بہت بخشنے والا بہت ہی مہربان ہے۔ اے نبی! اپنے پاس موجود قیدیوں سے کہہ دیجیے: اگر اللہ کو تمہارے دلوں میں خیر معلوم ہوگی تو جو کچھ تم لوگوں سے لے لیا گیا ہے اُس سے بہت بہتر تمہیں عطا فرمادے گا، اور تمہیں معاف بھی فرما دے گا، اور اللہ بہت بخشنے والا بہت ہی مہربان ہے۔

مندرجہ بالا جملہ آیات کریمہ میں وارد مفردات ما سوائے " اَلْاِثْخَانُ" کے بہت آسان اور عام فہم ہیں۔ آیہ مندرجہ بالا میں کلمہ " **يُثْخِنَ**" مجرد سے بصیغہ واحد مذکر غائب، فعل مضارع معروف آیا ہے۔ جبکہ قران حکیم میں ہی یہ کلمہ دو جگہ پر استعمال ہوا ہے اور دوسرے مقام پر یہ کلمہ باب افعال سے "**اَثْخَنْتُمُوْا**" جمع مذکر غائب فعلِ ماضی معروف کے طور پر وارد ہوا۔ مگر شروع میں لفظِ " اِذَا " کے ورود کے باعث معنی یہاں بھی مضارع میں ہی مطلوب ہے۔ فصحائے عرب کے کلام سے استشہاد کرتے ہوئے اگر اِس کلمہ کا حقیقی معنی معلوم کر لیا جائے تو اِن اسلامی اساسیات کی تعبیری بنیاد کو درست سمت سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ سورہ محمد میں ارشادِ پاک ہے:

"فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ذٰلِكَ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَا انْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ وَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ [7]

ترجمہ: تو جب تم لوگوں کا کفار کے ساتھ مقابلہ ہو تو پھر گردنیں مارنا، یہاں تک کہ جب تم لوگ اُن کو ایک مربوط بند وبست کے تحت لے آؤ تو پھر مشکیں خوب کس دینا، پھر اِس کے بعد یا تو بطورِ احسان یا بعوضِ فدیہ، یہاں تک کہ جنگ

[7] "(سورہ محمد:47، آیت:4)

اپنے ہتھیار ڈال دے، بات یہ ہے، اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی وہ مؤثر امداد کے ذریعے ہی اُن سے نجات دِلا دیتا، لیکن اُس کی مشیت یہ ہے کہ وہ تمہی میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈال دے، اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں شہید کر دیئے گئے ہیں تو وہ ہر گز اُن کے اعمال کو ضائع نہیں فرمائے گا۔

علامہ جار اللہ زمخشری اِس آیہ کریمہ میں "اَثْخَنْتُمُوْا" کے ذیل میں " وَ مَعْنَی الْاِثْخَانِ " کے تحت لکھتے ہیں:

" کَثْرَةُ الْقَتْلِ وَ الْمُبَالَغَةِ فِيْهِ ۔ مِنْ قَوْلِهِمْ : اَثْخَنَتْهُ الْجَرَاحَاتُ اِذَا اَثْبَتَّهٗ حَتّٰی تَثَقَّلَ عَلَيْهِ الْحَرْكَةَ ۔ وَ اَثْخَنَهُ الْمَرَضُ : اِذَا اَثْقَلَهٗ مِنَ الثَّخَانَةِ ۔ اَلَّتِیْ هِیَ الْغِلْظُ وَ الْكَثَافَةُ [8]۔"

ترجمہ: قتل میں کثرت اور اِس عمل میں مبالغہ۔ یہ کلمہ عربوں کے اِس قول: ": اَثْخَنَتْهُ الْجَرَاحَاتِ " سے ماخوذ ہے۔ اور یہ تب ہوتا ہے جب زخموں سے چور شخص کے اوپر حرکت کرنا گراں ہو جائے۔ اور عرب کہتے ہیں: "اَثْخَنَهُ الْمَرَضُ " یہ تب ہوتا ہے جب کسی کو بیماری پوری طرح سے جکڑ لے۔ اور "الثَّخَانَة": گھنے پن اور کثافت کو کہتے ہیں۔

علامہ زمخشری کی تفسیری رائے کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو آپ کے نزدیک قتل سے مراد کچھ اَور ہو تو ہو، جان لے لینا تو نہیں بنتا۔ علامہ زمخشری نے خود جو عرب محاورات بیان کیے ہیں، آپ خود غور فرما لیجیے ہر جگہ پر جیسی بھی ہے اور جس بھی شکل میں ہے مگر زندگی کی رمق بہر حال موجود ہے۔ پھر قتل کے نتیجے میں اگر کسی کی جان ہی چلی جاتی ہے تو بتایئے قتل و خونریزی میں کثرت اور اِس میں بھی مبالغہ پر مبنی مؤقف کیسے درست ہو سکتا ہے؟ اِس مؤقف کو درست مان لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ جس جس پر آپ کو قابو حاصل ہو جائے اُس کو قتل کر دینا لازم ہو جائے گا۔ تو

---

[8] ۔ زمخشری، محمود بن عمر، جار اللہ، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل و عیون الاقاویل فی وجوہ التاویل، بیروت، دار الکتاب العربی، بلا سن طباعت، ص: 225، ج: 2

قیدی کس کو بنائیں گے ؟اور جب جنگِ بدر میں رسول کریم ﷺ نے قیدی بنائے ہیں، جیسا کہ متذکرہ بالا آیت کریمہ میں بھی اِن قیدیوں کا ذکر آیا ہے، تو آپ ﷺ کا عمل اِس مؤقف کے سراسر منافی ہی شمار ہو گا۔ اور رسولِ کریم ﷺ کے عمل سے بہتر اور بڑھ کر کوئی تفسیری رائے تو معتبر نہیں ہو سکتی۔ آپ ﷺ کے اِس عمل سے صاف عیاں ہے کہ جہاں جہاں مزاحمت ہے وہاں مزاحمت کو پوری قوت کے ساتھ ٹکر ضرور دی گئی ہے۔ اِسی لیے تو غزوہ بدر میں ستر کے قریب کفار مارے گئے ہیں۔ اور جہاں مزاحمت دم توڑ دیتی ہے تو آپ ﷺ بھی قتل و خونریزی سے ہاتھ روک لیتے ہیں۔ اِسی لیے تو ستر کے قریب کفار گرفتار ہو کر قیدی بھی بنے ہیں۔ ورنہ تو سیدھے سیدھے کفار کے مقتولین کی کل تعداد 140 سے متجاوز ہوتی اور رسولِ کریم ﷺ کے پاس کوئی قیدی موجود ہی نہ ہوتا۔ لہٰذا کلام عرب سے علامہ زمخشری نے اپنے مؤقف کی تائید میں جو محاورات نقل کیے ہیں اُن سے بھی آپ کے مؤقف کی نفی ہو جاتی ہے اور خود رسولِ کریم ﷺ کا عمل بھی علامہ کے اِس مؤقف کی نفی ہی کرتا نظر آتا ہے۔ اِسی تناظر میں جب ہم لفظِ "اَلْاِثْخَانُ" کو سمجھنے کی سعی کرتے ہیں تو ہمیں صاف نظر بھی آتا ہے کہ قتل و خونریزی کرنا اور اِس عمل میں بھی مبالغہ سے کام لینا بنیادی طور پر اِس کلمہ کے معنی میں داخل و شامل ہی نہیں ہے۔ لغت و ادب میں بھی اِس کلمہ کا معنی حسبِ ذیل ہی نظر آتا ہے۔ راغب اصفہانی کا بیان ہے:

"ثَخُنَ الشَیْءُ فَهُوَ ثَخِیْنٌ اِذَا غَلُظَ فَلَمْ یَسِلْ وَ لَمْ یَسْتَمِرَّ فِیْ ذَهَابِهٖ "[9]

ترجمہ: عربی میں "ثَخُنَ الشَیْءُ فَهُوَ ثَخِیْنٌ "، تب کہا جاتا ہے جب کوئی شے گاڑھی ہو کر بہنے کے لائق نہ رہے اور اپنی روانی برقرار نہ رکھ سکے۔

علامہ ابن منظور افریقی کا بیان ہے:

[9] راغب اصفہانی، حسین بن محمد بن مفضل، معجم مفردات الفاظ القرآن، کراچی، میر محمد کتب خانہ، بلا سن طباعت، ص: 75، مادّہ: ث خ ن

"حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ : حَتّٰی یَتَمَکَّنَ فِی الْاَرْضِ ۔ وَ الْاِثْخَانُ فِیْ کُلِّ شَیْءٍ : قُوَّتُہٗ وَ شِدَّتُہٗ "۔[10]

ترجمہ:حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ: یہاں تک کہ اُس زمین پر متمکن (قابو پا کر مکمل قبضہ و اختیار کا مالک) ہو جائے۔اور" الْاِثْخَانُ": کسی بھی چیز میں قوت وشدت کو بیان کرتا ہے۔

اِسی طرح ہم جب ذخیرہ ادبِ عربی سے رجوع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ معروف عرب شاعر عجاج کہتا ہے:

"اَوْ یَبْتَغُوْا اِلَی السَّمَآءِ دَرَجًا حَتّٰی یَعِجَّ ثَخَنًا مَّنْ عَجْعَجَا"[11]

ترجمہ: یا پھر اِس حال میں وہ یہی چاہیں گے کہ سیڑھی لگا کر آسمان پر جا چڑھیں، یہاں تک کہ جس کو بھی چیخنا ہے وہ پوری شدت و قوت کے ساتھ چیخ چلا اُٹھے۔

یہ حقیقت تو مسلم ہے کہ عہدِ جاہلیت کا آخر آخر، عرب ادبیاتِ عالیہ کا عہدِ زریں ہے۔لٰہذا ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری کے بقول عہدِ جاہلیت کے آخر آخر[12] سے تعلق رکھنے والا معروف جاہلی شاعر اَعشٰی بھی یہ کلمہ استعمال کرتا ہے اور کہتا ہے:

"عَلَیْہِ سَلَاحُ امْرِئٍ مَاجِدٍ تَمَھَّلَ فِی الْحَرْبِ حَتّٰی اثَّخَنْ"[13]

---

[10] ابن منظور، محمد بن مکرم،بن منظور،لسان العرب،سعودی عرب،کویت،دارالنوادر،2010ء،ص:226،ج:16

[11] ج، عبد اللہ بن رؤبہ ، دیوان عجاج، بروایتِ عبد الملک بن قریب الاصمعی، تحقیق: ڈاکٹر عزۃ حسن، بیروت ، دار الشرق العربی، 1995ء،ص:351

[12] المصری،طہٰ حسین،ڈاکٹر،ادب الجاہلی،مترجم: محمد رضا انصاری،دہلی،انجمن ترقی اردو(ہند)طبع اول:1946ء،ص:415

[13] الاعشَی الکبیر،میمون بن قیس،دیوان الاعشَی الکبیر،جامیزت،مکتبۃ الاداب،بلاسنِ طباعت،ص:25،قصیدہ:2،بیت نمبر:71

ترجمہ: وہ شخص ایک بزرگ آدمی کی طرح مسلح ہے، جنگ میں تب تک مہلت دیتا ہے جب تک پوری طرح سے قابو نہ پالے۔

اعشٰی کے شعر میں "اَلْاِثْخَانُ" سے یہ کلمہ باب افتعال سے ہو کر استعمال ہوا ہے۔ یہاں اِس کی اصل "اِثْتَخَنَ" ہے۔ کلمہ کا پہلا حرف "ث" تھا۔ لہٰذا قانون کے تحت تائے افتعال، "ث" سے بدل گئی ہے۔ اور ادغام کے قانون کے تحت "ف" کلمہ میں مدغم ہو گئی ہے۔ لہٰذا باب افتعال میں آکر خواہ کوئی بھی کلمہ ہو، بجائے خود اُس میں اِس باب کی خاصیت کے باعث پختگی اور دوام کا ایک مزید عنصر داخل ہو جایا کرتا ہے۔ لہٰذا عہدِ رسالت مآب علیٰ صاحبہ التحیۃ والصلوٰۃ میں یہ کلمہ "مضبوط و مؤثر انداز سے قابو رکھنا یا قابو پالینا" کا معنی ہی دیتا نظر آتا ہے۔ خود عہدِ رسالت مآب علیٰ صاحبہ التحیۃ والصلوٰۃ میں اِس کلمہ کے محاوراتی استعمال پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ ابو رافع سُلّام بن ابی الحُقَیق کے قتل کے ضمن میں راوی حضرت عبد اللہ بن عتیک الانصاری اپنے بیان میں یہ کلمہ حسبِ ذیل ترکیب و بندش کے ساتھ استعمال کرتے ہیں:

"فَاَضْرِبُہٗ ضَرْبَۃً اَثْخَنَتْہٗ وَ لَمْ اَقْتُلْہُ"۔[14]

ترجمہ: تو پھر میں نے اُس کے اوپر ایک ایسی ضرب لگائی جس نے اُس کو ڈھیر کر دیا مگر اُس کو قتل نہیں کر دیا تھا۔

اِن شواہد کے مد نظر پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مترجمین قرآن کریم نے "اَلْاِثْخَانُ" کے درست معنی مراد نہیں لیے ہیں۔ اور بادیٔ النظر میں یہیں سے مسلم رویے اور لب ولہجہ میں وہ شدت پیدا ہونا شروع ہوئی ہے جو بعد کے وقتوں میں سنبھالے نہ سنبھل سکی۔ روئے زمین پر ایک ایسے نظم و نسق اور ضبط و ارتباط کا قیام جس سے حضرت انسان اپنے خداداد مقام و مرتبۂ اشرف المخلوقات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو جائے، یقیناً پیغمبرانہ وظائف و مناصب کی شان اور جان ہے۔ اِس کے ماورآء نہیں۔

[14] بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، محولہ بالا، ص: 577، ج: 2

"اَلْاِثْخَانُ" سے قتل و غارت گری اور خوں ریزی میں مبالغہ و شدت مراد لینے کی کوئی گنجائش آپ ﷺ کے عمل ہی نہیں بلکہ اِن شواہد مندرجہ بالا کی روشنی میں بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ لہٰذا "تاآنکہ قتلِ بسیار بوجود آرد در زمین"[15] کی صحت پر سوالیہ نشان آجاتا ہے۔ اگرچہ یہ معاملہ یہاں سے شروع بھی نہیں ہوا ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو اِس شدت پسندی کی بنیادیں بہت پہلے کے تعبیری اسالیب میں بھی ملتی ہیں۔ اور بادیٔ النظر میں اِس کی دو ہی وجوہات ہیں۔ ایک وحی الٰہی کو سمجھنے کے لیے عقل نارسا پر ضرورت سے زائد بھروسہ، اور دوسری وجہ زمانہ مابعد کے لوگوں کا اپنی عقل و دانش کو کام میں لانے کی بجائے فقط اگلوں کی نقالی ہی کرتے چلے جانا ہے۔ درست کی جگہ نادرست کو ہی پذیرائی ملنا حیرت انگیز ہی نہیں افسوسناک بھی ہے۔ پھر انہی نقوش کو زمانہ مابعد کے ہمارے علماء نے اپنے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کے تفسیری سرمائے کے صفحات پر اِسی نادرست مؤقف سے ملتا جلتا ایک عمومی تاثر سا بن گیا ہے۔ اور ہوتے ہوتے یہی مسموم تاثر اسلامی اور قرآنی تعلیم کے طور پر پیش بھی کیا جانے لگا ہے۔ جن تفاسیر سے بالعموم استفادہ کیا جاتا ہے اُن میں یہی پیغام دیا گیا ہے۔ مثلاً سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں: "جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے"[16] امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں: "یہاں تک کہ وہ اِس کے لیے ملک میں خونریزی برپا کردے"۔[17]، البتہ تراجم و تفسیری آراء میں کہیں کہیں مثبت پہلو بھی موجود ہیں۔ پیر کرم شاہ الازہری ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہاں تک کہ غلبہ حاصل کرلے زمین میں"[18]، پروفیسر شکیل اوج نے بھی اپنا نتیجہ فکر پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

---

15 محدث دہلوی، قطب الدین احمد بن عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ، قرآن مجید مترجم، ترجمہ فارسی، (3/343) لاہور، پاک کمپنی، بلا سن، ص:223

16 مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، تفہیم القرآن، محولہ بالا، ص:158، ج:2

17 اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، جولائی:2005ء، ص:510، ج:3

18 الازہری، کرم شاہ، پیر، ضیاء القرآن، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، جمادی الثانیہ:1402 ہجری، ص:66-165، ج:2

"عام طور پر کسی شے میں اثخان کا لفظ مبالغہ اور اِکثار کو ظاہر کرتا ہے، پس (حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ) کے معنی زمین پر غلبہ حاصل کرنے کے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ جنگ میں غلبہ کے حصول کے لیے خونریزی بھی کرنی پڑتی ہے"۔[19]

حالانکہ خونریزی میں مبالغہ واِکثار کی جگہ دشمنوں پر قابو پالینا زیادہ سود مند اور مفید ہو سکتا ہے۔ جنگی حالات اپنی ضروریات خود طے کرتے ہیں۔ لہٰذا پیشگی ہدایات کے ذریعے کسی بھی فریق کے ہاتھ پاؤں باندھے نہیں جا سکتے۔ مگر اسلامی اساسیات کی اِن تعبیری بنیادوں میں چھپے ہوئے ایک بہت بڑے اور نہایت خطرناک سقم کی نشاندہی صاحبِ تفسیر کبیر فخر الدین رازی نے کر رکھی ہے۔ آپ نے خود ایک متوازن اور قرین صحت مؤقف پیش کیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ دیگر مفسرین کے مؤقف میں پائی جانے والی شدت پر گفتگو بھی فرمائی ہے۔ اور بتایا ہے کہ دیگر مفسرین" اَلْاِثْخَانُ "کو قتل وخونریزی میں مبالغہ پر محمول کر لینے کی وجہ کیا بتاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

" اَلْاِثْخَانُ فِیْ کُلِّ شَیْءٍ عِبَارَۃٌ عِنْ قُوَّتِہٖ وَ شِدَّتِہٖ ۔ یُقَالُ: قَدْ اَثْخَنَہُ الْمَرَضُ ، اِذَا اشْتَدَّ قُوَّۃُ الْمَرَضِ عَلَیْہِ۔ وَ کَذٰلِکَ اَثْخَنَہُ الْجَرَّاحُ ۔ وَالثَّخَانَۃُ الْغِلْظَۃُ ۔ فَکُلُّ شَیْءٍ غَلِیظٍ فَھُوَ ثَخِیْنٌ،فَقَوْلُہٗ(حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ) مَعْنَاہُ : حَتّٰی یُقَوِّیَ وَ یَشْتَدَّ وَ یغلِبَ وَ یُبَالِغَ وَ یَقْھَرَ۔ ثُمَّ اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْمُفَسِّرِیْنَ قَالُوْا الْمُرَادُ مِنْہُ : اَنْ یُّبَالِغَ فِیْ قَتْلِ اَعْدَآئِہٖ ۔ قَالُوْا وَ اِنَّمَا حَمَلْنَا اللَّفْظَ عَلَیْہِ لِاَنَّ الْمُلْکَ وَالدَّوْلَۃَ اِنَّمَا تُقَوِّیْ وَ تَشْتَدُّ بِالْقَتْلِ"[20]

ترجمہ:" اَلْاِثْخَانُ "کی درست تعبیر تو ہر شے کی قوت اور شدت ہی ہے۔" قَدْ اَثْخَنَہُ الْمَرَضُ "،اُس وقت کہا جاتا ہے جب کسی مرض کی شدت زور پکڑ کر کسی کو جکڑ لے۔ اور شدت وقوت کا یہی معاملہ" اَثْخَنَہُ الْجَرَّاحُ

[19] اوج، محمد شکیل، پروفیسر، ڈاکٹر، صاحبِ قرآن ﷺ، جامعہ کراچی، مسندِ سیرت، اپریل: 2013ء، ص: 164

[20] رازی، ضیاءالدین عمر، التفسیر الکبیر، مصر، مکتبہ بہیہ، بلا سن، ص: 201، ج: 25، ج: 13

" کے ساتھ بھی ہے۔ اور " اَلثَّخَانَۃُ " کہتے ہیں گاڑھے پن کو۔ اِس لحاظ سے ہر وہ شے جو گاڑھی و غلیظ ہو گی وہ "ثَخِیْن" بھی ہو گی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے فرمان: (حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ)، کا معنی ہے: یہاں تک کہ خوب طاقت و شدت پکڑ لے اور غالب آجائے اور اِس میں مبالغہ کرے اور سختی کرے۔ پھر معاملہ یہ ہے کہ یقیناً مفسرین میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جنہوں نے کہا ہے کہ اِس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے قتل میں مبالغہ کرے۔ اِن مفسرین کا کہنا ہے کہ ہم نے اِس لفظِ " اَلْاِثْخَانُ " کو اِس معنی پر اِس لیے محمول کیا ہے کہ ملک و حکومت تو بس قتل سے ہی مضبوطی پکڑتے ہیں۔

جنگ ایک ایسی شے ہے جو اپنی ترجیحات کا تعین آپ سے آپ کرتی ہے۔ مثال کے طور پر دشمن توپ خانہ اور آتشیں ہتھیار لے کر میدان میں آ پہنچے تو آپ تلواریں اور نیزے تھام کر اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجاۃ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا اِسلام اپنے پیروکاروں کو کسی خونخوار دشمن کے مقابل بزدلی اور کم ہمتی کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ میں پیٹھ دکھانے کی سختی سے ممانعت ہے۔

"یٰاَیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۔ وَ مَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍفَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰهُ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ[21]"

ترجمہ: اے ایمان والو! جب کفار کے ساتھ تمہارا دو بدو مقابلہ ہو جائے تو انہیں پیٹھ مت دکھانا۔ اور جو شخص مقابلہ کے اِس روز پیٹھ دکھائے گا، البتہ پینترا بدلنے کی خاطر یا کسی جماعت کی طرف جگہ بنانے کے لیے، تو وہ شخص یقیناً اللہ کے غضب کی زد میں آجائے گا، اور اُس کا ٹھکانہ جہنم ہو گا اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔

[21] " (الانفال:8، آیات:15-16)

اِس لیے دورانِ قِتال بزدلی، کم ہمتی یا کمزوری دکھانے کی اجازت دینا تو دشمن کو خود پر حاوی کرنے اور ایک ظالم کو ظلم کی دعوت دینے کے مترادف عمل ہے۔ عقل و خرد بھی ایسی کسی گنجائش کی کبھی حامی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ ظلم و جارحیت تک کی اجازت مل گئی ہے۔ لہٰذا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اپنی اپنی دانست میں فقط ایک مخصوص مصلحت کے پیش نظر مفسرین کرام نے اختیاری طور پر اِس کلمہ کو یہ معنوی پیکر عطا کیا ہے۔ بادیٔ النظر میں نظمِ قرآنی اِس امر کا مؤید نظر نہیں آتا۔ گویا فخر الدین رازی جیسے ایک بالغ نظر و باریک بیں مفسر کی طرف سے یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ نصِّ قرآنی کا اپنا اقتضاء ہر گز نہیں تھا۔ اِس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ حقیقت فراموش ہو کر رہ گئی ہے کہ رسول کریم رحمۃ للعالمین بن کر تشریف لائے ہیں۔ اور از اول تا آخر آپ ﷺ کی حیات طیبہ اِسی رحمت و شفقت کی بیکرانی کا عملی نمونہ بن کر ہی سامنے آئی ہے۔ آپ ﷺ کسی بھی تباہی و بربادی کو کسی طور قبول و گوارا تک نہیں فرما سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ غزوہ بدر کے موقعہ پر آپ ﷺ کا عمل بھی مفسرین کی اِن پر تشدد آراء کے بالکل برعکس اور سراسر رحمت و مہربانی ہی کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ گویا سیاست شرعیہ کے اصول بھی نظر انداز ہوئے ہیں۔ یہ بنیادی بات بھی مدّ نظر نہیں رہ پائی ہے کہ یہ نصوص قرآنی دراصل اِسلامی آئین و قانون کی بنیاد ہیں اور خشتِ اول میں داخل کی گئی اِس ارادی کجی کے اثرات و نتائج کیا کیا ہوں گے؟ اِسی طرح بے خوفِ تردیدی کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی اساسیات کی تعبیری بنیادیں بھی انسانی عقل کی اِس آمیزش کے باعث مجروح ہوئی ہیں۔ اَب اِس کے نتیجے میں اسلام کے عمومی منظر نامے سے عدم مطابقت کے باعث جو مشکلات آنے والے وقتوں میں ابھر کر سامنے آسکتی ہیں اُن کا بھی ایک کامل ادراک کیا جا سکتا ہے۔ بلا شبہ جنگ کے اندر قتل و خونریزی میں شدت و مبالغہ ایک کریہہ المنظر عنصر ہے جس کی خواہش نہیں کی جا سکتی۔ رسولِ کریم ﷺ کی حرب و ضرب کے باب میں اختیار کردہ حکمتِ عملی کے تعلق سے معروف محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی حسبِ ذیل رائے حقیقت کے بہت قریب معلوم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"آنحضرت ﷺ کی سیاست قریش کو تباہ (و) نابود کرنے پر نہیں بلکہ بالکل محفوظ رکھ کر بے بس اور مغلوب کر دینے پر مشتمل تھی۔ پانچ چھ ہی سال کی کوشش میں مکے کے شمال، مکے کے مشرق، بلکہ مکے کے جنوب

کے قبائل بھی اسلام کے زیرِ نگیں بنا لیے گئے۔ اور جب یہ گھیرا مکمل ہو گیا تو بجائے شرائط منوانے کے آنحضرت ﷺ نے قریش کی منہ مانگی شرطیں حدیبیہ میں منظور کیں۔ یہ سیاست کاری کا شَہ کار تھا۔ قریش کا چڑھتا ہوا جوش اور بخار اس صلح کے سیفٹی وَالو(Safety Valve)سے خارج ہو گیا"۔[22]

تصریحات مندرجہ بالا کی روشنی میں باآسانی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے کہ کس طرح بظاہر ایک چھوٹے سے تصرف کے ذریعے اسلام کی حیات افروز اور سراسر فلاحی و تعمیری اساسیات کے تعبیری اسالیب میں غیر ضروری طور پر سختی ودرشتی کا محلول گھول دیا گیا ہے۔ اوراِن اسالیب کا رُخ موڑ کر انہیں جنگل کے قانون سے جوڑ دیا گیا ہے۔ عموماً کہا تو جاتا ہے کہ جنگل میں طاقت راج کرتی ہے۔ مگر یہ ایک عامیانہ بات ہے۔ حقیقت سے اِس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ورنہ اگر طاقت ہی راج کر سکتی تو جنگل میں ہاتھی اور گینڈے راج کرتے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ شیر کی طاقت متذکرہ دونوں جانوروں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ شیر ہی جنگل کا راجہ ہے۔ اور سب اِسی سے ڈرتے ہیں۔ وجہ اُس کی فقط یہ ہے کہ متذکرہ بالا دونوں جانور چرندے ہیں اور فقط گھاس ہی چرتے ہیں۔ جبکہ شیر درندہ ہے اور گوشت پوست اِس کی مرغوب غذا ہے۔ لہٰذا گوشت پوست کا ہر چھوٹا بڑا مجموعہ اُس کی خوراک ہے اور چیر پھاڑ میں دیر بھی نہیں کرتا۔ لہٰذا اہل فہم ودانش کے لیے یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ جنگل میں طاقت راج کرتی ہے۔ اِس کی جگہ یہ کہنا زیادہ قرینِ صواب ہو گا کہ جنگل میں درندگی وسفاکی اور وحشت وبربریت راج کرتی ہے۔ سیاست شرعیہ کی جو بنیادیں خود رسول کریم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے بھری ہیں، وہ نہایت رحمدلانہ نیز تعمیری وفلاحی نظام کی عکاس ہیں۔ اور جنگل کے قانون یا طاقت ووحشت راج کی عین ضد ہیں۔

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مکی دور مکمل طور پر صبر واستقامت کا دور ہے۔ تحمل اور برداشت اِس دور کی خاص شناخت ہے۔ قریش مکہ کے ہر طرح کے ظلم وجور کے مقابل آپ ﷺ نے ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے

[22] ڈاکٹر، محمد حمید اللہ، عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی، کراچی اردو اکیڈمی سندھ، سنِ طباعت:2006ء، ص:30-229

ساتھ غیر معمولی صبر واستقامت کا مظاہرہ فرمایاہے۔ صرف ایک مثال پر ہی غور فرمالیجیے۔اور حضرتِ بلال بن رباح کے قبولِ اسلام کے بعد جس جس طرح سے ظلم وستم ڈھائے گئے وہ کسی پر مخفی نہیں ہیں۔ لہٰذا انہیں ذہن میں رکھتے ہوئے یہ بھی دھیان کر لیا جائے کہ حضرت بلال بن رباح نے اپنی غیر معمولی جسامت وقدامت کے ساتھ ایک غلام کی حیثیت سے زندگی گزاری تھی۔اِس مشقت نے آپ کی طاقت اور توانائی کو اَور بھی غیر معمولی بنادیا تھا۔ حتیٰ کہ انہیں لڑنے کے لیے کسی نیزہ یا تلوار کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اگر تپتی ریت پر ایذا پہنچانے والے قریش کے چھوکروں کے سامنے سر وقد اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے اور ایک ایک ہاتھ ہی رسید کر دیتے تو اُن کا کام تمام ہو جاتا۔ پھر سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کون سی طاقت ہے جس نے حضرت بلال بن رباح کی اِس جسمانی طاقت کو لگام دے رکھی ہے اور قریش کے چھوکروں کے ہاتھوں ظلم وجور برداشت کرنے کا پابند بنا رکھا ہے؟اِس سوال کا جواب اِس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جس ذاتِ تقدس وتعالیٰ پر حضرت بلال بن رباح ایمان لائے ہیں اور اُس کے وہ رسول مکرم ﷺ جن کی دعوت پر ایمان لا کر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے ہیں اُن کی طرف سے کسی بھی مزاحمت کے خلاف مزاحمت کرنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ کسی کو بھی اور کسی بھی صورت برابری کی ٹکر نہیں دی جاسکتی۔نہ ہی کسی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔ صرف حضرت بلال ہی نہیں تمام ضعفائے مسلمین مکی دور میں اِسی طرح کی ایذا رسانی کا شکار رہے ہیں۔

ابن ہشام لکھتے ہیں:

"اِنَّهُمْ عَدَوْا عَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَ اتَّبَعَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ مِنْ اَصْحَابِہٖ۔ فَوَثَبَتْ كُلُّ قَبِيْلَةٍ عَلٰی مَنْ فِيْهَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ فَجَعَلُوْا يَحْبِسُوْنَهُمْ وَ يُعَذِّبُوْنَهُمْ بِالضَّرْبِ وَ الْجُوْعِ وَ الْعَطَشِ بِرَمْضَاءِ مَكَّةَ اِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ مَنِ اسْتَضْعَفُوْا مِنْهُمْ" [23]

[23] ابن ہشام، عبد الملک بن ہشام، السیرۃ النبویہ بر حاشیہ الروض الانف، ملتان، عبد التواب اکیڈمی، بلا سن، ص:202، ج:1

ترجمہ: آپ ﷺ کے اصحاب میں سے جو جو شخص بھی اسلام قبول کر لیتا اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا دم بھرنے لگ جاتا، قریش مکہ اُس پر اپنی عداوتوں کے جوہر آزمانے لگ جاتے۔ لہٰذا مسلمانوں کے اِس گروہ میں جو بھی شمولیت اختیار کر لیتا، ہر قبیلہ اُس کے اوپر جھپٹ پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ اِن کو حبس بے جا میں رکھتے اور اِن کو سزائیں دینے لگ جاتے جن کی کئی شکلیں ہوتیں۔ مثلاً مارتے، بھوک اور پیاس سے ایذا پہنچاتے اور گرمی جب بہت شدت اختیار کر لیتی تو اِن میں سے کمزور وناتواں لوگوں کو مکہ مکرمہ کی گرم تپتی زمین پر لٹا کر اذیتیں دیتے تھے۔

تکلیف دہی اور ایذا رسانی کے تمام جوہر آزمائے گئے۔ مگر اہل اسلام میں سے کسی کی طرف سے کوئی بھی مزاحمت نظر نہیں پڑتی۔ پورے صبر و ہمت کے ساتھ آپ ﷺ خود اور آپ ﷺ کے ساتھی اصحاب اِن قطعی نا مساعد حالات کا مقابلہ اور سامنا بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ کنارہ کشی تو ضرور دیکھنے میں آئی اور حبشہ کی جانب ہجرت بھی ہوئی مگر کسی جگہ مخالفین کے ساتھ پنجہ آزمائی کی راہ اختیار نہیں کی گئی۔ بالآخر جب ہجرت مدینہ کا وقت آیا تو بھی اپنا گھر بار چھوڑ کر بھی طرح طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ پُر امن رہتے ہوئے ہی مدینہ طیبہ کا رُخ کر لیا تھا۔ مدینہ منورہ پہنچ کر وہاں کی گھٹن سے آزاد فضاؤں اور کھلے ماحول میں ابھی سکھ کا سانس بھی نہیں لے پائے تھے کہ مشرکین مکہ کے غیض وغضب کے طوفان مدینہ طیبہ کی فصیلوں سے آآ کر ٹکرانے لگے۔ مدینہ طیبہ قریش مکہ کے حملوں کی زد میں آ گیا تھا۔ صلح حدیبیہ وہ پہلا موقع ہے جب رسول کریم ﷺ اپنے جانثاروں کے ساتھ مکہ مکرمہ کا رُخ کرتے ہیں۔ اور وہ بھی عرب روایات کے عین مطابق نہایت پر امن طریقے پر سفر فرماتے ہیں۔ جنگ کا ارادہ یا اُس کا اعلان تو در کنار اپنی تلواروں کو نیام میں رکھ کر عمرہ کا اعلان فرما دیتے ہیں۔ مگر زائرین حرم کو حاصل تحفظ کے قانون اور ضابطے بھی کسی کام نہیں آتے۔ سفرِ حدیبیہ کا ذکر کرتے ہوئے معروف سیرت نگار ابن ہشام لکھتے ہیں:

"خَرَجَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَامَ الْحُدَيْبِيَةَ يُرِيْدُ زِيَارَةَ الْبَيْتِ ۔ لَا يُرِيْدُ قِتَالًا۔ وَ سَاقَ مَعَهُ الْهَدْىَ سَبْعِيْنَ بُدْنَةً وَ كَانَ النَّاسُ سَبْعَمِاَةِ رَجُلٍ"[24]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ صلح حدیبیہ والے سال بیت اللہ شریف کی زیارت کا ارادہ لے کر نکلے۔ آپ ﷺ کا جنگ کا قطعی ارادہ نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے اِس سفر میں قربانی کے ستر جانور بھی ساتھ لے لیے تھے۔ اور آپ ﷺ کے ہمراہیوں کی کل تعداد سات سو نفوس پر مشتمل تھی۔

آپ ﷺ کے بموقع صلح حدیبیہ، اِس سفر سے پہلے کے جملہ واقعات کو ایک ترتیب کے تحت ملاحظہ کرنے سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جارحیت پسندی اور جنگی جنون کس طرف ہے؟ اور یہ کہ رسول کریم ﷺ کی طرف سے دفاع کی خاطر کیا حکمتِ عملی اختیار کی گئی ہے۔ رمضان سن 2 ہجری میں قریش مکہ ایک لشکر لے کر مدینہ طیبہ پر چڑھائی کے ارادے سے آگے بڑھتے ہیں۔ آپ ﷺ اُن کا سامنا کرنے کے لیے مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر میدان بدر کا انتخاب کرتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ مدینہ طیبہ کو دشمن کے ہاتھوں تاخت وتاراج اور اہلیانِ مدینہ کو تباہ و برباد ہونے سے بچانے کی خاطر یہ اقدام کیا گیا تھا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ میدانِ بدر میں کیا کیا اور کیسے کیسے ہوا؟ اِس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے فقط یہ گن لیجیے کہ یہ پہلا موقع ہے جو رسولِ کریم ﷺ نے اپنے دشمنوں کو اُن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے دے دیا ہے۔

جنگ سے سنبھلنے کے بعد آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اِن حملہ آور مشرکین مکہ کو سبق سکھانے کے لیے مکہ مکرمہ کا رُخ کر سکتے تھے۔ مگر آپ ﷺ ایسا نہیں کرتے۔ اِس کی بجائے اَب گنتی کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ بہت ہی مختصر عرصے میں قریش مکہ کے جنگی عزائم کے باعث بدر کی طرح احد کا میدان بھی سج جاتا ہے۔ یہاں بھی گھمسان کا ہی رن پڑتا ہے۔ یہ شوال سن 3 ہجری کی بات ہے۔ میدان بدر میں ماننے کی بات ہے کہ قریش مکہ کو

[24] ابن ہشام، عبد الملک بن ہشام، السیرۃ النبویہ، محولہ بالا، ص:226، ج:2

بھاری نقصان سے دوچار ہونا پڑا تھا۔اِس لیے ،اگرچہ ایسا ہے نہیں، مگر کسی کو خیال آ سکتا ہے کہ رسولِ کریم ﷺ کو مکہ کا رُخ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔میدان احد میں مسلمانوں کا اُسی طرح سے بھاری نقصان ہوا ہے جیسا کہ مشرکین مکہ کا میدانِ بدر میں ہوا تھا۔چنانچہ اَب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ حملہ آور قریش مکہ کو اتنا نقصان پہنچا کر ہی قرار آ جاتا ہے۔دوسرے ہاتھ پر اَب تو مناسب موقع اور جواز موجود ہے نا کہ بدلہ لینے کے لیے رسول کریم ﷺ مکمل تیاری کے ساتھ مکہ کا رُخ کرتے اور سبق سکھا کر واپس آتے ؟ مگر آپ ﷺ اللہ کے برگزیدہ رسول ہیں۔ہماری سوچوں اور خیالوں سے بھی باہر و عظیم تر ہیں۔بنی نوع انسان کے لیے سراپا رحمت بن کر تشریف لائے ہیں۔آپ ﷺ حیات افروزی وحیات بخشی کے ضامن ہیں۔لہٰذا آپ ﷺ کی شان کے لائق ہی نہیں ہے کہ بدلہ اُتارنے کے لیے ہی سہی مگر جنگ کی آگ بھڑکا دیں۔دیکھا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ پورے صبر و سکون کے ساتھ مدینہ طیبہ میں ہی قیام فرما ہیں۔البتہ قریش مکہ کو جو مواقع دیئے جانے تھے اُن کی تعداد اَب دو ہو گئی ہے۔اور ابھی ایک اَور موقع دیئے جانے کی گنجائش بھی باقی ہے۔

پورے دو سال بعد شوال سن 5 ہجری میں ایک بڑی اور بھرپور تیاری کے ساتھ قریش مکہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کا ارادہ لے کر پھر پلٹ آتے ہیں۔اَب کی بار انہوں نے جزیرہ نمائے عرب کے دیگر قبائل کو بھی ساتھ ملا لیا ہے۔اِس طرح پورے جزیرہ نما کے نمائندہ قبائل نے بھی قریش مکہ کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔اور جنگ کرنے کے لیے دس ہزار کا ایک لشکر جرار بھی مہیا کر لیا تھا۔اتنے بڑے لشکر کا سامنا مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر کرنے کی صورت میں مدینہ طیبہ غیر محفوظ ہو سکتا تھا۔کیونکہ لشکریوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ دو حصوں میں بٹ کر بھی مؤثر کارروائیاں کر سکتا تھا۔لہٰذا رسولِ کریم ﷺ اپنی حکمتِ عملی تبدیل فرما کر مدینہ طیبہ کے گرد خندق کھود کر شہر اور شہریوں کا دفاع کرتے ہیں۔دشمن کم و بیش ایک ماہ تک مدینہ طیبہ کو محصور کیے رکھتا ہے۔اور بالآخر ناکام و نامراد ہو کر واپس چلا جاتا ہے۔البتہ ساتھ ہی یہ کام بھی کر جاتا ہے کہ اپنے حصے کا تیسرا موقع بھی استعمال کر لیتا ہے۔یکطرفہ طور پر رسول کریم ﷺ حملہ آور قریش مکہ کو یہ تین بڑے بڑے مواقع دیتے ہیں۔مگر

پھر بھی اِن حملہ آوروں کے کلیجے میں ٹھنڈ نہیں پڑتی۔ نہ ہی آپ ﷺ اُن کے جارحانہ عزائم سے متاثر ہو کر کسی جارحیت کا ارادہ تک ہی فرماتے ہیں۔

البتہ چوتھا موقع بھی دے دینا یا ایک کے بعد ایک اَور موقع ہی دیتے چلے جانا اَب کسی زاویے سے بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ ذوالقعدہ سن 6 ہجری میں رسول کریم ﷺ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عمرہ کی نیت سے مکہ مکرمہ کا رُخ فرماتے ہیں۔ جملہ آثار و قرآئن یہی گواہی دے رہے ہیں کہ آپ ﷺ کسی جنگی ارادے کے تحت تشریف نہیں لائے ہیں۔ بلکہ آپ ﷺ کو صرف بیت اللہ شریف کی زیارت اور عمرہ کی ادائیگی ہی مقصود ہے۔ مگر پھر بھی قریش مکہ کے اوسان خطا ہو گئے اور ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں۔ قریش مکہ تھے تو بڑے زیرک اور سمجھتے تھے کہ عالمِ عربی کی نظروں میں رسولِ کریم ﷺ کے اِس پُر امن سفر اور حدیبیہ تک آ پہنچنے کے باعث قریش مکہ کی ناک ہی کٹ کر رہ گئی ہے۔ اگرچہ آپ ﷺ کے اِس اقدام میں کوئی جنگی عزائم مضمر نہیں تھے۔ مگر اِس طرح سے سروں پر آ پہنچنے کا ایک صدمہ ہی قریش مکہ کے لیے نیزے اور تلوار کے ہزاروں زخموں پر بھی بھاری تھا۔ معاہدۂ حدیبیہ کے پس منظر میں قریش مکہ کے ذہن کو رسولِ کریم ﷺ کے ساتھ سہیل بن عمرو کے ابتدائی مکالمہ کی روشنی میں بخوبی پڑھا جا سکتا ہے۔ جب سہیل بن عمرو نے صلح کے معاہدہ پر اصرار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ہم عمرہ کرنے کی غرض سے ہی آئے ہیں۔ آپ لوگ رکاوٹ نہ بنیں تو ہم عمرہ ادا کر کے واپس چلے جائیں گے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے:

" فَقَالَ سُهَيْلُ وَ اللهِ لَا تَتَّحَدَّثُ الْعَرَبُ اَنَّا اُخِذْنَا ضُغْطَةً ۔ وَ لٰكِنْ ذٰلِكَ مِنَ الْعَامِ الْمُقْبِلِ"[25]

ترجمہ: سہیل نے کہا: اللہ کی قسم یہ نہیں ہو سکتا۔ عرب ہمیں بُرا بھلا کہیں گے کہ ہماری حالت یہ ہو گئی تھی کہ ہمیں اچانک ہی دبوچ لیا گیا ہے۔ آئندہ سال ایسا ہو سکتا ہے۔

ابن ہشام نے حسبِ ذیل کلمات کے ساتھ اِس روایت کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

[25] بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کراچی، قدیمی کتب خانہ، 1961ء، ص:80-379، ج:1

"بَعَثَ قُرَيْشٌ سُهَيْلَ بْنَ عَمْرٍو اَخَا بَنِىْ عَامِرِ بْنِ لُؤَىْ اِلٰى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَقَالُوْا لَهُ ائْتِ مُحَمَّدًا فَصَالِحْهُ ۔ وَلَا يَكُنْ فِىْ صُلْحِهِ اِلَّا اَنْ يَّرْجِعَ عَنْهُ عَامَهُ هٰذَا ۔ فَوَاللهِ لَا تَحَدَّثُ الْعَرَبُ عَنَّا اَنَّهُ دَخَلَهَا عَلَيْنَا عُنْوَةً اَبَدًا "[26]

ترجمہ: قریش مکہ نے بنی عامر بن لوی سے سہیل بن عمرو کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا۔ تو اُس سے کہا کہ جاؤ محمد (ﷺ) کے پاس اور اُن سے صلح کرو۔ اور اِس بات کا خاص خیال رکھنا کہ اِس صلح میں یہ شرط ضرور شامل ہو کہ وہ اِس سال یہیں سے واپس چلے جائیں گے۔ ورنہ تو اللہ کی قسم! عرب ہمارے بارے میں ہمیشہ یہ باتیں کریں گے کہ آپ ﷺ ہمیں روندتے ہوئے مکہ میں داخل ہو گئے تھے اور زبردستی ہم سے صلح نامہ لکھوالیا تھا۔

آپ ﷺ نے دشمن کو تباہ و نابود تو نہیں کیا، مگر اِس مقام تک ضرور پہنچا دیا ہے کہ وہ ماضی کے اپنے بلند بانگ دعوؤں اور جارحانہ عزائم کے باعث دنیا کا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ قریش مکہ کی جان پر بن آئی تھی۔ اُن کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اُن کے اوپر آپ ﷺ کا بہت ہی غیر معمولی رعب اور ایک ہیبت سی طاری ہو گئی تھی۔ اَب اُن کے لیے جزیرہ نما کے اپنے ہم مذہبوں کے سامنے اپنا بھرم اور وقار بچائے رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ اِس بات کی انہیں بہت فکر بھی دامن گیر تھی۔ اِثخان کی حقیقت بھی یہی ہے۔ رسول کریم ﷺ اِس پوری صورتحال کا ادراک فرماتے ہوئے اپنے لرزہ براندام دشمن کو سہارا دے کر سنبھلنے کا پورا پورا موقع مہیا فرماتے ہیں۔ گویا ایک ایسا دشمن جو برسوں تباہ و نابود کر دینے کا نعرہ لگا کر مدینہ طیبہ پر حملہ آور ہوتا رہا ہے، آپ ﷺ کے سامنے زمین پر گرا پڑا ہے۔ مگر آپ ﷺ اِس گرے ہوئے دشمن کو یہیں پر روندھ ڈالنے کی بجائے اسے پاؤں پر کھڑا کر کے اُس کے کپڑوں سے گرد تک جھاڑ دیتے ہیں۔ آپ ﷺ اِس طرح سے جب اپنے گرے ہوئے دشمن کو اٹھا کر کھڑا کر رہے تھے۔ اور اُس کی ہمت بڑھا کر اور حوصلہ دے کر مردانہ وار مقابلہ کے لیے اُس کو اپنے سامنے کھڑا کر رہے تھے تو دراصل جریدۂ عالم کی جبیں پر اپنی عظمت کے انمٹ نقوش ثبت فرما رہے تھے۔ ہے کوئی اَور فاتح جس کی نظیر پیش کی جا سکے؟ عین اُس وقت جب آپ ﷺ اپنی ہر بات منوا سکتے تھے، قریش مکہ کو مکمل موقع اور اختیار دیتے ہیں کہ من چاہی شرائط صلح نامہ میں لکھوالیں۔ حتی کہ اِن اعدآء و مخالفین کے حوصلے اتنے بلند ہو جاتے ہیں کہ چت

[26] ابن ہشام، عبدالملک بن ہشام، السیرۃ النبویہ، محولہ بالا، ص: 229، ج: 2

AL-RAHEEQ International Research Journal
Vol. 2, Issue. 1 || January-June 2023 || P. 1-24

بھی میری، پٹ بھی میری اور انٹا میرے باپ کا، کی بنیادوں پر صلح نامہ کی شرائط تحریر کرواتے ہیں۔ موقع پر موجود اور تمام تر صورتحال کا ایک کامل تجزیہ وادراک رکھنے والے آپ ﷺ کے ساتھیوں میں یہ انقلاب دیکھ کر بے چینی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ تو اُن کو بھی سہارا دیتے ہیں۔ اور بس ایک ہی اپنی پسندیدہ شرط کہ دس سال تک دونوں فریق آپس میں جنگ نہیں کریں گے، معاہدہ میں شامل کروا کر صلح نامہ حدیبیہ کی منظوری دے دیتے ہیں۔ قرآن حکیم کی اڑتالیسویں سورۂ مبارکہ نے اِسی کو فتح مبین قرار دیا ہے۔ سورۂ فتح کے تعارف میں علامہ زمخشری فرماتے ہیں:

"نُزِّلَتْ فِی الطَّرِيْقِ عِنْدَ الْاِنْصِرَافِ مِنَ الْحُدَيْبِيَةِ"[27]

ترجمہ: یہ سورۂ مبارکہ حدیبیہ سے واپسی پر دورانِ سفر نازل ہوئی ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ دشمن کو مسلنے یا کچل کر رکھ دینے کی بجائے اُس کو محفوظ رکھ کر بے بس ولا جواب کر دینے اور اپنی حکمت ودانش کا لوہا منوا کر اُس کو باوقار انداز میں راہ راست پر لے آنے اور تابعِ فرمان بنا لینے کو ہی قرآن حکیم فتح مبین قرار دیتا ہے۔ آپ ﷺ کے اُسوۂ مبارکہ کے اِس پورے منظر نامے کو دیکھتے اور سمجھتے ہوئے کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ ﷺ کو جنگ پسند تھی؟ یا یہ کہ جنگ برپا کرنے میں آپ ﷺ کبھی یا کسی طرح کی کوئی دلچسپی رکھتے تھے؟

فی زمانہ ہم نشاۃ نو کے ابتدائی مراحل سے گزر رہے ہیں۔ ماضی میں یقیناً ہم سے کچھ ایسی خطائیں سرزد ہوئی ہیں جن کے باعث ہمیں بہت ہی غیر معمولی زوال و پستی اور ادبار وانحطاط کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک انسان خود فانی ہے لہٰذا اِس کی فکر بھی لازوال نہیں ہو سکتی۔ انسانی حکمت ودانش ہو یا مصلحت کوشی، کبھی بھی حکمتِ الٰہیہ اور رسولِ مکرم ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کے ہم وزن یا ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔ ہماری عقل نارسا کی حقیقت تو خود قرآن حکیم نے ہی واضح فرما دی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[27] زمخشری، محمود بن عمر، جار اللہ، الکشاف، محولہ بالا، ص: 331، ج: 4 (جامعہ کراچی، ہفتہ، 30، جنوری 2021ء، نظر ثانی: 06 فروری 2021ء)

"كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَ عَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ عَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" [28]

ترجمہ: تمہارے اوپر قتال لازم کیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے، اور عین ممکن ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو حالانکہ وہی تمہارے لیے سراپا خیر ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی شے کو پسند کرو حالانکہ وہی تمہارے لیے سراپا شر ہو۔

اِس لیے ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم خود کو "قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ وَ قَالَ الرَّسُوْلُ ﷺ وَ عَمِلَ بِہٖ" کی حدود کے اندر ہی رکھیں۔ بادیٔ النظر میں اسلامی تعلیمات جنگل راج، طاقت و وحشت راج یا اِس نوع کے کسی بھی دوسرے راج کی نفی پر مبنی ہیں۔ ہمارے مفسرین کرام میں سے جنہوں نے بھی " اَلْاِثْخَانُ " کے معنی میں اپنی عقل و دانش کی بنیاد پر یہ شدت پسندانہ عناصر داخل کیے ہیں انہوں نے اسلامی تعلیمات کی نفی کی بنیاد رکھ دی ہے۔ آخر کچھ تو وجوہات ہیں کہ جہاد جیسی پُر اَمن اور تلاش حسن کی عالمگیر تحریک کے اوپر بھی قتال کا رنگ غالب آگیا۔ اور ہر کس و ناکس نے اپنے ہاتھوں میں بندوق تھام لی اور ثواب کی کمائی شروع کر دی ہے۔ حدود سے تجاوز کے بعد معاملات پر کسی بھی طرح کا قابو یا اختیار باقی نہیں رہا کرتا۔ یہ اَمر بھی باعث حیرت ہی ہے کہ قتل و خونریزی میں کثرت کے مؤقف کو صدیوں تک بڑے بڑے اہلِ علم و دانش نے بے چون وچرا قبول کیا ہے۔ حد یہ ہے کہ فخر الدین رازی جیسے بلند پایہ مفسر کی طرف سے نشاندہی بھی کسی کام نہیں آئی۔ اور اِس نوع کی جملہ آراء قرینِ صحت ہونے کے باوجود بھی کاملاً فراموش ہو گئی ہیں۔ لہٰذا بہت ضروری ہے کہ اسلامی اساسیات میں اِس طرح کی آمیزشوں کا پتا لگایا جائے اور اِن کے مضر اثرات سے دامن بچا کر ہی آگے بڑھا جائے۔ بصورتِ دیگر نشاۃ نو کے اِس مرحلے میں بھی آمیزشوں کے سلسلے حیاتِ نو کو، خاکم بدہن، دیرپا نہیں رہنے دیں گے۔

[28] (البقرہ:2، آیت:216)

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial-ShareAlike 4.0 International (CC BY-NC-SA 4.0)